ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE: 2789-8784

ZAUQ-E-TAHQEEQ

www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com

ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.2(2024)
(April to June)

قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول "کارِ جہاں دراز ہے" کا تنقیدی مطالعہ

Critical Review of Qurat-ul-Ain Haider's Autobiographical Novel "Kar-e-Jahan Daraz Hay"

ڈاکٹر فرید حسینی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف چکوال، چکوال

ڈاکٹر شمائلہ سلیمان

وزیٹنگ فیکلٹی، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف نارووال، نارووال

Dr. Fareed Hussaini
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Chakwal, Chakwal
Dr. Shumaila Suleman
Visiting Faculty, Department of Urdu, University of Narowal, Narowal

Abstract:
Qurat-ul-Ain Haider was born in 1927 in Aligarh. This was the time when British Rule was at its full swing. But meanwhile political activities began after establishment of Khilafat Movement. Aini brought in the United India where inter-religion harmony was existed and people lived with peace and prosperity.But, eventually with the start of the 2nd World War the interior atmosphere of the country became polluted with dirty politics. Qurat-ul-Ain a young citizen witnessed all the situation and experienced the crash of civilization.In her autobiography "Kar-e-Jahan Daraz Hai", she told not only the family's matter but also narrated historical events of that era. In this article, efforts have been made to take critical analysis of the autobiographical novel.

Keywords: Qurat-ul-Ain Haider, Aligarh, establishment, United India, atmosphere, autobiography, historical events

سوانحی تحریریں آٹو فکشن تکنیک کے برتے پر ناول کے درجے کو پالیتی ہیں۔ آپ بیتی جیسی ذاتی تجربے میں آئی بات یا واقعہ کو افسانوی پیرایہ عطا کرنا مہارت اور چابکدستی کا متقاضی ہے۔ مکمل کھردری سچائی کو تخیل کی رنگ آمیزی سے یوں آمیخت کر دینا کہ صورتِ واقعہ میں تبدیلی لائے بنا فن پارہ کی حیثیت حاصل ہو، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں لیو ٹالسٹائی کے تین ناول "Childhood"، "Boyhood" اور "Youth" جو بالترتیب ۱۸۵۲ء، ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۶ء میں منظرِ عام پر آئے بہت اہم ہیں۔ Thomas Hughes کا "Tom Brown's School Days" جس کا سنِ اشاعت ۱۸۵۷ء ہے، وقیع تخلیق ہے۔ لوئیسا مے الکاٹ کا ٹل ووومن اسی زمانے کا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۱ء میں چارلس ڈکنس کی دو تخلیقات ڈیوڈ کاپر فیلڈ اور گریٹ ایکسپیکٹیشن گویا کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے، خصوصاً موخر الذکر کو ان کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ پھر بیسویں صدی میں سوانحی ناولوں کی طویل فہرست ہے جن پر دنیا بھر کے فکشن نگاروں نے اس صنف کی مقبولیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس پر طبع آزمائی کی۔ ارنسٹ ہیمنگوے کا "A Farewell to Arms"

، جیمس جوائس کا "A Potrait of the Artist as a Young Man"، ڈی ایچ لارنس کا سنز اینڈ لورز، مارسل پراوسٹ کا "In Search of Last Times" اور جارج ایلیٹ کا "The Mill on the Floss" ایسی تخلیقی کاوشیں ہیں جنھوں نے پوری دنیا میں مقبولیت سمیٹی۔

اُردو ناول نگاری کی کوتاہ عمری کے باوجود اس قبیل کے کئی ناول منظرِ عام پر آئے جو فنی اعتبار سے کی گئی سوانحی ناول کی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کا "شریف زادہ"، "دو ملک ایک کہانی" (ابراہیم جلیس)، "غالب" (قاضی عبدالستار)، "گیان سنگھ شاطر" (گیان سنگھ شاطر)، "علی پور کا ایلی" (ممتاز مفتی)، "غمِ دل وحشت" (محمد حسن)، "دل بھٹکے گا" (احمد بشیر)، "دیواروں کے بیچ" (ندا فاضلی)، "دل کے آئینے میں" (احسن فاروقی) وغیرہ اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

قرۃ العین حیدر ایک مشّاق لکھاری ہیں جن کے جینز میں فن کارانہ صلاحیتیں موجود تھیں اور جن کو عمیق مطالعے اور گہرے تاریخی شعور نے مزید جلا بخشی۔ والدین اور اقربا کے خطوط نے اس ناول کے خاکے میں رنگ بھرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس کا اعتراف بھی غالباً انھوں نے کر رکھا ہے۔ یہ ناول فقط خاندانی حالات کا کوائف نامہ نہیں ہے بلکہ اس میں ہندوستان کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی عہد کی جھلکیاں تاریخی شعور کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ اس کو ذوقِ نظر اور باریک بینی سے پڑھا جائے تو بدلتا ہوا منظر نامہ (جس میں روایت کا چمنستان جدت کے آہنی پہیے کے نیچے کچلا چلا جا رہا تھا) اور مغلیہ سلطنت کی زوال آمادہ تہذیب مغربی سویلائزیشن کے بلیک ہول کی نظر ہو رہی تھی اور علی گڑھ کی روشن خیالی کے بطن سے مسلم ایلیٹ کلاس کی Survival اور الگ تشخص کی آڑ میں سماج دو واضح دھڑوں میں منقسم ہونے کی Paradoxic صورتِ حال اٹل حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔ جنگِ آزادی کے ہیرو جو مغل اقتدار کی بحالی کے متمنی تھے اس میں عینی کے اجداد بھی شامل تھے۔ اس وقت کی فضا کی بوالعجبی اور بھیانک منظر کو یوں بیان کرتی ہیں:

> "مزاج دہر تباہ ہو چکا۔۔۔ رات کے وقت آسمان پر سُرخ مریخ دہک کے انگارہ ہو گیا۔ روزانہ دونوں وقت ملتے۔ ایک دمدار ستارہ خلقت کو نظر آتا ہے۔ گاؤں گاؤں چپاتی بٹی۔ راتوں کے سناٹے میں ایک پراسرار فقیر بھیانک آواز میں صدا لگاتا ہے۔" (۱)

ان کے جدِ امجد جونپور میں جاگیروں کے مالک تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ کمپرومائز ہوئے مگر غدر میں باغی ہو گئے:

> "منکہ میر احمد علی ابن حضرت اخوند امام بخش ترمذی نہٹوری میرٹھ چھاؤنی میں تعینات تھا۔ جب کمان افسر نے حکم دانتوں سے کارتوس کاٹنے کا دیا۔ سپاہیوں نے انکار کیا۔ بغاوت شروع ہوئی۔۔۔ ہم بھی اس معرکے میں شریک تھے۔ کیونکہ دین خطرے میں تھا۔" (۲)

۱۸۵۷ء کے حالات کی سنگینی افسانوی انداز لیے ہوئے ہے مگر تاریخی حقائق کا عکس دکھائی دیتی ہے۔ ناکام جدوجہد اور شکست خوردگی کے بعد مسلمان بحیثیت مجموعی زندگی سے مایوس ہو کر دربدری کا شکار ہو گئے۔ یہاں ناول نگار نے سرسید تحریک کو ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کے نئے دور سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے والد کی تعلیم و تربیت جس عہد میں ہوئی وہ گویا جدید دور کا آغاز

تھا، جس کے اندر انگریزی زبان کی مکمل عمل داری ہو چکی۔ سرسید تحریک کی پروڈکٹ کا ایک نمائندہ کردار قرۃ العین کے والد سجاد حیدر خود تھے۔ اس لیے انھوں نے اس بابت قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ سید سجاد حیدر کی ملازمت اور اُن کا رہن سہن اور سوچ کے زاویے سب انگریز سرکار کی منشا پوری کرتے نظر آتے ہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ نیچری طرز استدلال اور جدت نے روایت اور ماضی سے رشتہ توڑ کر آگے بڑھنے کا جو نعرہ لگایا اس میں مصنفہ کے والدین پوری طرح فٹ نظر آتے ہیں۔ کمپنی کی حکومت تک میں بھی ایک ایلیٹ کلاس موجود تھی جو ہزار سالہ مسلم اقتدار کی پروردہ تھی اور اس میں بہت حد تک روایت سے رشتہ استوار تھا مگر تاجِ برطانیہ کی حکومت میں کلاس بدلی اور پرانے نظام کی جگہ نئے نظام نے لی۔ عینی نے اس ناول میں اسی سسٹم کو بیان کیا:

> ''انھوں نے زیادہ تر اودھ کے جاگیر دارانہ معاشرے کے معاشی زوال، حال سے ناآسودگی اور احساس عدم تحفظ کو ہی بطور موضوع اپنایا ہے۔''(۳)

مابعد غدر اشرافیہ وجود میں آئی، اس میں سے کچھ پرانی باقیات تھیں (اور عینی کا خاندان سرسید کی طرح وہی باقیات تھا) اور کچھ نئی وجود میں آئی جو زمینوں کی بندر بانٹ اور سرکاری عہدے تفویض کرنے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ سرسید تحریک اور نئے تعلیمی نظام کے خلاف زیریں سطح پر ناول نگار نے طنزیہ انداز میں اپنا نقطہ نظر دیا ہے جو اس وقت کی نسل میں موجود تھا اور وہ گویا بادلِ ناخواستہ صورتِ حال کو قبول کر رہے تھے اور یہ استدلال سرسید کا ہی تھا۔ مگر عمومی انداز میں ایک مخصوص احساسِ تفاخر ان کی تحریر میں ٹپکتا ہے۔ نوکروں، گھریلو ملازموں کا ذکر ان پڑھ، جاہل، توہم پرست، بیوقوف اور ضعیف العقیدہ قسم کے لوگوں کے طور پر آتا ہے۔ چھوٹی ذاتوں مثلاً دھوبی، چمار، مراثی، تیر گر، کلال وغیرہ کو انھوں نے ''کمین'' درج کیا ہے جنھوں نے ان کے جدی قطعات زمین پر (نہٹور میں) جھونپڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> ''کمینوں میں سے کسی کی عورت مر جائے، بھاگ جائے یا ناپسند ہو تو بازار میں اس کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔ جمعہ کے دن گاگن کے نزدیک امریوں میں جو پینٹھ لگتی ہے اس میں عورتیں بیچی جاتی ہیں۔ ''کمین'' اپنی پسند کی جرو اخرید لاتے ہیں۔ اچھی ثابت نہ ہو تو اگلی پینٹھ میں لے جا کر بیچ کر دوسری لے آتے ہیں۔ عمر اور شکل کے لحاظ سے کمین عورتیں بیس سے پچاس روپے تک میں مل جاتی ہیں۔''(۴)

سرسید تحریک کے پروردہ دراصل سرسید کی فکر کے نمائندہ تھے۔ انھوں نے خود اسبابِ بغاوتِ ہند میں باغیوں کو کمی (جولاہے وغیرہ) کہہ کر اشرافیہ کے عدم شرکت کو Justify کیا ہے۔ اعلیٰ ذات (بزعم خود) کی عورتیں برقعے چادریں اتار کر مخلوط اکٹھ میں آ رہی تھیں یا ناچ گانا کر رہی تھیں (فن کار بن رہی تھیں) تو وہ سب جدیدیت تھا اور غریبوں کی پسند ناپسند پاپ ثابت کیا جا رہا تھا۔ آزادی پسند (قطع نظر طریقہ کار کے) کمی کمین تھے اور انگریز کے کاسہ لیس اشراف اور نجیب الطرفین تھے۔ یہ بوالعجبی ہی کہی جا سکتی ہے۔ قرۃ العین حیدر خود مندرجہ بالا ذہنیت (Mind Set) کی گواہی دیتی ہے:

''بڑی اماں مایوں کے کمرے میں موجود تھیں۔ ''عذرا میں تو اب آنکھوں سے کچھ پڑھ نہیں پاتی تم کوئی اچھا افسانہ ہو تو پڑھ کر سناؤ۔'' عذرا نے پڑھنا شروع کیا'' رامو قلی نے دو دن کے فاقے کے بعد جب اپنی جھونپڑی میں ___ ''آگے چلو'' بڑی اماں نے اکتا کر کہا۔ عذرا بی نے ورق پلٹے۔ ''اچھا سنیے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ہے ۔ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے غریب کسانوں کے متعلق سنیے۔'' ان کی بڑی اماں کچھ دیر چپ بیٹھی سنتی رہی، پھر بولیں ''کسان لڑکی کے مکھن جیسے پاؤں ۔ بچاری کسان لڑکیوں کے پاؤں دھول میں اٹے ہوتے ہیں۔ جی بی۔''(۵)

عذرا نے جو جواب دیا وہ کچھ یوں تھا:

''بڑی اماں''۔ عذرا بی نے پلکیں جھپکا کر کہا۔ آپ فیوڈل دور کی ادیبہ ہیں، یہ عوامی ادب ہے۔''(۶)

خاندانی کہانی میں ان کے والدین سمیت دوسرے اقربا کی قربت معاشرے کے آسودہ اور بڑے سماجی رتبہ کے لوگوں کے ساتھ دکھائی گئی ہے۔ تحصیل دار کلکٹر، سپرنٹنڈنٹ پولیس، سفارت کار وغیرہ حتیٰ کہ ترک وزیر اعظم تک رسائی بھی معمول کی کارروائی دکھائی گئی ہے۔ علامہ اقبال، امتیاز علی تاج، حجاب امتیاز جیسے سرکردہ ادیبوں سے میل ملاقات بھی والدین کی ادبی قدر و منزلت کو باور کرانے کا تاثر لیے ہوئے ہے۔ البتہ ان کرداروں کے توسل سے واقعات کی معنویت کا ادراک قاری کے لیے آسانی کا باعث بنتا ہے اور اس وقت سماج سے ہماری شناسائی ہو جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں جو نو آبادیاتی خرابیاں نظر آتی ہیں اور جن کے تدارک کے ممکنہ اقدامات کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں، وہی کالونیل نظریات اور ان کی آبیاری ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں عیاں ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے:

''میکالے اور ہندوستان کے مغرب پرست طبقے دونوں کے نزدیک تہذیب و ترقی کا معیار مادی ترقی سے مشروط ہو گیا۔ انسانی شخصیت کی ناتمامی اور غیر عقلیت کا سبب محض سماجی نظام کی ناتمامیوں میں ڈھونڈا جانے لگا اور ساری کوشش ایک ایسے نظام کی تشکیل کے لیے وقف کر دی گئی جو مغربی تہذیب کے معیاروں سے ہم آہنگ یا دوسرے لفظوں میں ہر لحاظ سے مکمل ہو۔''(۷)

سماجی نظام کو مغربی اصولوں اور ضابطوں کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی عیب جوئی کی گئی۔ یوں بالواسطہ آقاؤں کے مقاصد کی تکمیل ہوتی رہی۔ ادبی منظر نامہ اس زمانے کا کچھ یوں تھا کہ اولین افسانے اور ناول تخلیق ہو رہے تھے۔ یلدرم کی ذاتی زندگی اور طبعی رجحانات کے کئی پہلو ترکی ادب کی خوشہ چینی اور اس صنف کی ترویج کے اسباب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ نظامِ تعلیم علی گڑھ میں جو رائج ہوا، وہ زور و شور سے جاری تھا، اس نظام کے حسن و قبح قرۃ العین حیدر نے بہت دل چسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ تقسیمِ ہند کے پس منظر میں کلچر کو زیرِ بحث لاتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

"سینئر سویلین نے ذرا خفگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "آپ یہ فلم پروڈیوس کر رہی ہیں؟ لکھی کس نے ہے؟"

"سکرپٹ اور کمنٹری ناچیز ہی نے لکھی ہے۔"

"سن چالیس میں پاکستان کا جو سکرپٹ لکھا گیا تھا۔ اس میں رقص و سرود کا کہیں ذکر نہ تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سکرپٹ کی تصنیف میں آپ کے والد ماجد کا بھی کافی ہاتھ تھا۔"(۸)

مہاجرت اور بے گھری، زندہ بچ جانے والوں کے لیے موت سے کم سانحہ نہ تھا جس کو برصغیر کے لاکھوں لوگوں نے جھیلا۔ یہاں بھی اشرافیہ نے فوائد سمیٹے۔ جس طرح کی زندگی سرحد سے پار قبل از تقسیم تھی، اس جیسی یا اس سے بڑھ کر آسائشوں سے بھرپور مہاجرت کے بعد بھی ان کا مقدر ٹھہریں۔ اپنے خاندان کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"خانادن کے تمام سویلین اور فوجی افراد اب عالی شان اور خوب صورت کوٹھیاں بنوانے میں مصروف تھے یا کب کی بنوا چکے تھے۔"(۹)

قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں منتقل ہوئیں تو یہاں کے حالات بھی تفصیل اور جزئیات کے ساتھ سوانحی ناول کا حصہ بنے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا اسلوب اتنا دل کش اور جاندار ہے کہ وہ عمومی بات اور واقعہ کو بھی حسنِ بیان سے سحر انگیز بنا دیتی ہیں۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ثقافتی مسائل کے ساتھ ساتھ روزمرہ کے معمولاتِ زندگی بھی ناول کی رنگ آمیزی میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ علمِ بیان کی مدد سے ان کی تحریر میں حسن و دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے:

"آج دوپہر بارش ہوئی تھی گرمیوں کی بارش۔ آپ جانیے جیسے پریوں کے آنسو بہہ رہے ہوں پائیں باغ کے برآمدے میں کتنی دیر تک برسنے والے پانی کو دیکھتی رہی۔ پھر یکایک غمگین ہو گئی۔ اٹھ کر خس کا عطر لگایا۔ وحشتِ دل کا علاج ٹہل کر کیا۔"(۱۰)

مٹتی ہوئی تہذیب اور مشترکہ روایات کی وہ عینی شاہد تھیں اور اس دور کے تجربے کو انھوں نے کرداروں کے اندر جذب کر کے اس سوانحی ناول کا حصہ بنایا۔ ہجرت سے قبل انسانی سوچوں میں کھینچی جانے والی لکیر کو انھوں نے نفسیاتی مسئلے کے طور پر بیان کیا ہے۔ قاری غیر محسوس طریقے سے ان عوامل میں سے دورانِ خواندگی گزرتا ہے جو تاریخ کے دھارے کو بدلنے کا باعث بنے۔ ہندوستان سے پاکستان اور پھر برطانیہ اور آخیر میں اپنے ہندوستان جانے کے سفر میں بھی ان کی بے چینی دراصل ان کے فن کارانہ حساس طرزِ فکر کی عکاسی کرتی ہے۔

کردار نگاری میں قرۃ العین حیدر کو ملکہ حاصل ہے۔ خصوصاً اعلیٰ متوسط اور فیوڈل طبقے کی نمائندگی کرنے والے کردار مکمل و اکمل نظر آتے ہیں۔ بے ضمیری اور موقع پرستی جیسی صفات حالات کے جبر سے زیادہ ابن الوقتی کا پتہ دیتی ہیں۔ نسوانی کرداروں میں جس طرح رنگ بھرتی ہیں یہ ان کی انفرادیت ہے۔ شاید یہ ہر فن کار کا نفسیاتی مسئلہ ہوتا ہے کہ اس کی افتادِ طبع کہیں نہ کہیں کرداروں کی Craft میں ضرور اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ عینی کی اپنی ذاتی انا، سخت گیری اور خود پسندی ان کے نسوانی کرداروں میں عیاں ہے۔ دیپالی سرکار، ہیتا، چمپا وغیرہ کے کردار ناولوں کے ہیں مگر "کارِ جہاں دراز ہے" میں ان کی والدہ 'نذر سجاد' کا کردار ان کے والد کی نسبت متحرک جاندار اور Authoritative ہے۔ خاندانی خواتین میں جدیدیت کی حامی اور قدامت پرست ہر دو طبقات کو عمدگی سے ناول کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ذاتی اوصاف اور سماجی مرتبے کے لحاظ سے ان کے قبیلے کے مرد حضرات بھی اعلیٰ درجے پر فائز نظر آتے ہیں

مثلاً پولیس اور مالیات تک افسران میں نیک نیتی اور ایمانداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ عوام الناس کی ضعیف العقیدگی اور جہالت بالواسطہ یوں بیان ہوئی ہے کہ وہ سید خاندان کی قبروں کی توقیر کو بھی باعثِ نجات تصور کرتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ نو آبادیاتی نظام نے ہی طبقاتی تقسیم کو ہوا دے کر اپنے خفیہ ایجنڈے کی تکمیل کی۔ برصغیر کی قدیم سماجی تقسیم دنیا کی بدیہی حقیقت تھی جو عرب و عجم کی تخصیص کے بغیر ہر جگہ اپنا ثبات کرتی تھی مگر اس تفریق میں عصبیت کے باوجود نفرت نہ تھی اور جینے اور جینے دو کا اصول کار فرما تھا۔ اس سوانحی ناول میں زندگی کے تلخ و شیریں دونوں حقائق بیان ہوئے ہیں اور غالباً یہی ناول کا مقصد ہے۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی:

> ''زندگی ہر صنف کے لیے ضروری ہے مگر جتنے مکمل طور پر اور جتنی قریب آ کر زندگی کی ناول تخلیق کرتی ہے، اتنی کوئی اور صنفِ ادب نہیں کرتی۔''(۱۱)

زندگی کی ہماہمی ان کی تحریروں کا خاصا ہے۔ انھوں نے ایک کامیاب فن کار کے طور پر پہلے دو حصوں میں اپنی ذات کو ظاہر نہ کر کے کہانی کو کامیابی سے بیان کیا ہے۔ البتہ ان کا نقطۂ نظر سطور میں ضرور مستور ہے۔ رضی عابدی نے اپنی کتاب ''تین ناول نگار'' میں بحث کرتے ہوئے اس سوانحی ناول کی بابت لکھا تھا:

> ''ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' اظہارِ ذات اور تسکین انا کی آخری کوشش ہے جس کے بعد انھوں نے لگتا ہے کہ اپنی جذباتی الجھنوں پر قابو پالیا ہے۔''(۱۲)

قرۃ العین حیدر نے باقاعدہ پینٹنگ کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ شاید اسی لیے چیزوں کی رنگت، شباہت کو کئی رخوں سے دکھا کر قاری کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہرتی ہیں۔ لکھنؤ کا محاورہ اور روزمرہ زبان کو صاف اور شستہ رکھنے میں مد ثابت ہوا ہے۔ ان کی فن پر گرفت کی وجہ سے زبان و اسلوب میں پختگی کا تاثر ملتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا یہ ناول عجیب متذبذب صورتِ حال کا عکاس ہے۔ ناول نگار جدت کو بڑے چاؤ سے اپنا بھی رہی ہے مگر اس کو ماضی کے ورثے کے کھو جانے کا قلق بھی ہے۔ وہ مشترکہ روایات جس میں ہولی، محرم، دیوالی، کرسمس سب مل کر مناتے تھے۔ اب تقسیم در تقسیم نے رویوں میں بھی دراڑیں ڈال دی ہیں اس پر وہ ملول اور افسردہ بھی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، لاہور، مکتبۂ اردو ادب، سن ندارد، جلد اوّل، ص ۶۶

۲۔ ایضاً، ص ۶۷

۳۔ اشرف خالد، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۴۲

۴۔ قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، ص ۳۹۷

۵۔ ایضاً، ص ۴۰۳

۶۔ ایضاً، ص ۴۰۴

۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی، جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۶۷

۸۔ قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء، جلد اول، دوم، ص ۶۰۵

۹۔ ایضاً، ص ۶۷۹

۱۰۔ قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، بمبئی، فن اور فن کار، ۱۹۷۹ء، جلد دوم، ص ۲۵۰

۱۱۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۵۱ء، ص ۲۹۶

۱۲۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، دلی، کتابی دنیا، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

References in Roman Script:

1. Qarat-ul-Ain Haider, Kar-e-Jahan Daraz Hai, Lahore,Maktba Urdu Adab,Sun Nidarid, Volume I, p.66
2. Ibid, p. 67
3. Ashraf Khalid, Dr.,Barr-e-Sagair Mien Urdu Novel, Lahore, Fiction House, 2005, p.42
4. Qarat-ul-Ain Haider, Kar-e-Jahan Daraz Hai, p.397
5. Ibid, p. 403
6. Ibid, p. 404
7. Shamsur Rahman Farooqi,Jadidiat Ki Falsfiana Bunyad ,Delhi,Qaumi Council baraye Zuban-o-Adab, 2005, p.76.
8. Qarat-ul-Ain Haider, Kar-e-Jahan Daraz Hai, Delhi, Educational Publishing House, 2003, Volume I, II, p. 605
9. Ibid, p. 679
10. Qarat-ul-Ain Haider, Kar-e-Jahan Daraz Hai, Bombay, Art and Art, 1979, Volume II, p. 250
11. Ahsan Farooqi, Dr.,Urdu Novel Ki Tanqidi Tareekh, Lahore, Lahore Academy, 1951, p.296
12. Razi Abidi,Teen Novel Nigaar, Delhi, Kitabi Duniya, 2001, p.13